Chapter. 1

باب اوّل

اُردو افسانوی ادب میں عورت کے مختلف پیکر:

بابِ اوّل

اُردو افسانوی ادب میں عورت کے مختلف پیکر :

اُردو میں افسانہ ایک وسیع معنی ومفہوم کا حامل ہے۔ ''افسانہ'' کہانی کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ اس کی قدامت ، اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ نظم ونثر دونوں ہی اصناف ارتقاء کے مراحل طے کرتے رہے اسی طرح افسانہ بھی منزل بہ منزل پروان چڑھتا رہا ہے۔ قدیم اُردو کتابوں میں کہانی کی کوئی منظّم شکل تو نہیں ملتی لیکن حکایتیں ضرور ملتی ہے۔

قدیم طرز کی افسانہ گوئی کا ادوار سرشار اور ڈپٹی نذیر احمد کے طرزِ تحریر کی ابتداء سے ہوا تھا۔ انکی کتابوں نے ہندوستان میں معاشرتی اور مذہبی اصلاح کی۔ رتن ناتھ سرشار کی مشہور کتاب ''فسانۂ آزاد'' ''نذیر احمد کی توبۃ النصوح'' ''ابن الوقت'' ''بنات النعش'' اور مراۃ العروس'' اخلاقی زندگی کی نمائندگی کرتی تھیں۔ ہر کتاب مذہب، اخلاق اور معاشرت کی اصلاح کا آئینہ ہونے کے باوجود دہلی کے متوسط طبقے کی زندگی کا سچا اور بےلوث مرقع ہے۔ ادیبوں نے اور فنکاروں نے بدلی ہوئی فضا کا مطالعہ کر کے دانشمندی سے کام لیا۔ جس سے ادب کے نئے اور وسیع تقاضے مرتب کئے گئے۔ بقول ڈاکٹر آدم شیخ :

''۱۸۵۷ء سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک جو ادب پیدا ہوا وہ سماجی، معاشی اور سیاسی تقاضوں کا مرہون منت نظر آتا ہے۔ دربار کی ویرانی نے قصیدہ نگاری پر ضرب کاری لگائی، فارغ البالی کے فقدان اور فرصت کی کمی نے

داستانوں کا زور توڑا۔ نئے دور میں نہ دربار تھے، نہ وہ سرپرستی۔ ادیبوں نے نئے عہد کے تقاضوں کے پیش نظر لکھنا شروع کیا۔ پہلے فرد کے لئے لکھتے تھے اب جماعت کے لئے لکھنے لگے۔ ادیبوں کی اسی ذہنی وسعت نے ادب اور زندگی کے بہت سے تاریک گوشے منور کیئے۔'' (۱)

اصلاحی تحریک کے ساتھ ملک میں سیاسی شعور بھی فروغ پایا۔ بیداری کی اس لہر نے سرفروشی کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور جگہ جگہ قومی ترانے گائے جانے لگے تھے۔ لہٰذا ادیب اور فنکار کے ذہن بھی جذبۂ آزادی سے متاثر ہوکر سامنے آئے۔ ادیبوں اور فنکاروں نے اس عہد کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا جس نے افسانے کی شکل اختیار کرلی۔ اب ہندوستان میں صنعت کاری کی وجہ سے لوگوں کے پاس فرصت کے ایّام بھی ختم ہو رہے تھے۔ زندگی کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ انسان کے پاس طویل کہانی پڑھنے اور لکھنے کا وقت نہ رہا۔ روزی روٹی کے مسائل نے روز مرّہ کے معمولات میں تبدیلی پیدا کردی۔ فنکار نے تخیلات کی دنیا سے آزاد ہوکر حقیقی زندگی میں جھانکنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہانیاں لمبی ہونے کی بجائے مختصر ہوگئیں۔ یوں اُردو میں مختصر افسانے کی ابتداء ہوئی۔ بقول وقار عظیم :

''انسان کو اپنے تفریحی مشاغل میں کتربیونت اور کاٹ چھانٹ کرنی پڑی تو اس کا وہ مزاج جسے کہانی سننے کا چسکا ہمیشہ سے ہے، افسانہ کی ایک ایسی صنف کا طلبگار ہوا جو زندگی اور فن کو اس طرح سموئے کہ انسان کو اس سے ذہنی سرورومسرت کا سرمایہ بھی ہاتھ لگے، زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور اپنے ماحول کو حسین تر بنانے کی آرزو بھی پوری ہو اور اس کے باوجود اتنی

(۱) (اُردو افسانہ - ترقی پسند تحریک سے قبل۔ ڈاکٹر صغیر ابراہیم ص-۲۴) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۱ء

مختصر ہو کہ وقت پر اس کی گرفت مضبوط رہے، وہ اپنے بےشمار مشاغل میں سے بھی کہانی پڑھنے کا وقت نکال سکے۔ زمانے کے یہ سب تقاضے اور انسان کی یہ ضرورتیں مختصر افسانہ کی تخلیق کی بنیاد بنیں۔'' (۱)

بیسویں صدی کا آغاز اُردو افسانے کی ابتداء قرار دیا جاتا ہے۔ ناول کی طرح اُردو افسانہ بھی انگریزی اثر سے آیا مختصر افسانہ کی ابتداء ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی انتشار پھیلا ہوا تھا۔ قومی رہنما سیاسی وقومی تحریکوں سے عوام کو ہمارے مٹتے ہوئے تہذیب وتمدن سے آگاہ کر رہے تھے۔ مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی اثر (اثراندازی) کے خطرے سے عوام کو ہٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب مختصر افسانہ اُردو میں آیا۔ پریم چند نے اُردو کے افسانہ نگاروں میں اس بات کو سب سے پہلے محسوس کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کی باعظمت پُرانی تصویروں میں نیا آب ورنگ پیدا کیا۔ جن چیزوں کو لوگوں نے افسانہ سمجھ کر بھلانا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند نے انہیں نئے سرے سے زندگی کا لباس پہنایا۔ راجپوتوں کی زندگی سے افسانوں کے پلاٹ حاصل کر کے قارئین کے دلوں میں ماضی کی عظمت اور روحانی صفات پیدا کر کے وطن پرستی کا جذبہ پیدا کیا۔ بقول سلاحت اللہ خاں :

''تاریخی اعتبار سے ۱۹۰۰ء کے معارف میں شائع ہونے والا اُردو کا پہلا افسانہ سجاد حیدر یلدرم کا تھا۔ لیکن جدید اُردو افسانے کے موجد پریم چند ہیں اور ان کی رہنمائی میں ہی اُردو افسانے نے موضوع و فن دونوں لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کی ہے'' (۲)

پریم چند نے اُردو کے افسانوں میں صحیح انداز کی کردار نگاری کا رواج پیدا

(۱) (داستان سے افسانے تک (وقارعظیم ص-۱۹، ۲۰)

(۲) (اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل ڈاکٹر صغیرا فراہیم ص-۲۸) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۱ء

کیا۔ اسی لئے لوگ پریم چند کو اُردو کی مختصر افسانہ نویسی کا باپ کہتے ہیں۔

پریم چند اور یلدرم دو مختلف مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی کے الفاظ میں :

''ترقی پسند تحریک سے پہلے اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کے دو واضح میلانات ملتے ہیں۔ ایک حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کا جس کی قیادت پریم چند کر رہے تھے۔ دوسرا رومانیت اور تخیل پرستی کا جس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم ۔ کر رہے تھے''۔ (۱)

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی وغیرہ افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کی بہترین مثالیں دیں۔ جیسے کرشن چندر نے ''زندگی کے موڑ پر، ''ان داتا'' ''کالو بھنگی'' اور ''میں انتظار کروں گا'' پیش کی ہیں۔ بیدی نے ''گرم کوٹ'' اور ''ایک چادر میلی سی'' جیسے افسانے لکھ کر قاری کو چونکا دیا۔ اسی زمانے میں اُردو افسانے میں سعادت حسن منٹو کی آمد جدید اُردو افسانے میں نیا موڑ لاتی ہے۔ منٹو نے اُردو افسانے کو مصنوعی اخلاقی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ ''بانجھ، ٹھنڈا گوشت، کالی شلوار، خالی ڈبّے، نیا قانون'' وغیرہ انکے اعلیٰ درجے کے افسانے ہیں۔

اسی دور میں حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، محمد حسن عسکری، خواجہ احمد عباس، ممتاز مفتی، آغا بابر جیسے افسانہ نگار بھی ابھرتے ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اُبھرنے والے بڑے افسانہ نگاروں کی فہرست بہت لمبی ہے۔

اسی دور میں اور بعد میں کچھ خواتین افسانہ نگار بھی ہیں۔ جنہوں نے جنسی، رومانی، سیاسی، مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ اور بے باکی سے لکھا۔ ان

---

(۱) (اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل ڈاکٹر صغیرا فراہیم ص-۳۱) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۱ء

خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، اور قرۃالعین حیدر شامل ہیں۔

قرۃالعین حیدر نے ۱۹۴۴ء کے آس پاس اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ''سیتا ہرن'' ''پت جھڑ کی آواز'' ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' جیسے افسانے سے اُردو ادب کا دامن بھردیا۔

جیلانی بانو نے ''روشنی کے مینار'' ''ستی ساوتری'' جیسی تخلیقات دی ہیں۔ واجدہ تبسم حیدر آباد کی ہیں۔ اور وہاں کے بارے میں ہی لکھتی ہے۔ لیکن واجدہ کی شہرت ''اے رودِ موسیٰ'' اور ''شہر ممنوعہ'' جیسے افسانوں پر اب بھی قائم ہے۔

مذکورہ ترقی پسند تحریک کی اہل قلم خواتین میں سے عصمت چغتائی کو صف اوّل کی افسانہ نگار تسلیم کی جاچکی تھیں۔ ''کلیاں''، ''چوٹیں'' ''چھوئی موئی'' ''دو ہاتھ'' اُن کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔ ''ہندوستان چھوڑ دو'' ''لحاف'' اور ''پیشہ'' جیسے افسانوں نے عصمت کو اُردو ادب میں بے مثال شہرت اور مقبولیت عطا کی۔

پروفیسر وقار عظیم فرماتے ہیں:

''اُردو کے افسانہ نگاروں میں صرف عصمت چغتائی ہی ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کے ذکر اور تصور سے کچھ لوگوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور کچھ لوگوں کی پیشانی پربل پڑ جاتے ہیں۔ کچھ کو انکے افسانوں کے ذکر سے حد درجہ مسرت ہوتی ہے اور کچھ اس نام کے سنتے ہی لاحول پڑھنے لگتے

ہیں۔ اور میرے نزدیک دونوں طرح کے پڑھنے والے اپنی اپنی رائے میں حق بجانب ہیں۔ عصمت کے افسانوں کا موضوع اور ان کا طرز اور فن دونوں چیزوں میں بعض ایسے عناصر ہیں جو مختلف طرح کے لوگوں میں دو مختلف اور متضاد جذبات اور احساسات کو بیدار کرتے ہیں۔ ایک سے باچھیں کھلتی ہیں اور دوسرے سے پیشانی پر بل پڑتے ہیں'' (۱)

اگرچہ اُردو افسانے کی تاریخ مختصر ہے۔ لیکن اس میں عورت کے حوالے سے ایک طویل پس منظر موجود ہے۔ اُردو افسانوں میں عورت کے تصور کے بہت سے روپ بیان ہوئے ہیں۔ نسوانی کردار ہو یا مردانہ کردار ان کا مقام متعین ہے اردو افسانوی ادب نے عورت کے مختلف روپ مثلاً: ماں، بیٹی، بیوی، طوائف، محبوبہ نیز ہر پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔

ماں :

اردو ادب میں جتنے نسوانی کردار موجود ہیں ان میں سب سے اہم ماں کا کردار ہے۔ قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ''ماں جی'' اس کی مثال ہے۔ اس افسانے میں ماں محبت، سادگی اورتحفظ کا ایک انمول تحفہ ہے۔ ماں ایک گھنا سایہ ہے۔ ایک ایسا درخت کہ جس کے سایے میں سب سکھ ملتے ہیں۔ اس کے تصور کو دنیا کی کوئی بھی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

یہ فطرتاً ہوتا ہے کہ باپ کا لگاؤ بیٹی سے اور ماں کا بیٹے سے ہوتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''کوکھ جلی'' اس رشتے کو بیان کرتا ہے۔ گھمنڈی کا باپ شراب وشباب کا راستہ اختیار کئے ہوئے تھا۔ ان کے مرنے کے بعد

---

(۱) (نیا افسانہ - سید وقارعظیم۔ ص-۱۲۴) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۶ء

گھمنڈی بھی اس کے باپ کے راستے پر چل کر تباہ ہو چکا ہے۔ پھر بھی اس کی ماں تحفظ اور محبت دیتی ہے۔

نیلم احمد بشیر کا ''چارہ گر'' افسانہ ایک افسوس ناک ماں کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہےکہ وہ ماں جو کبھی سارے گھر کی مالک تھیں وہ اب اوپر کی منزل پر سامان والے کمرے میں بند ہیں۔ جہاں نوکرانی کے علاوہ کوئی نہیں جاتا۔ پریم چند کا افسانہ ''بدنصیب ماں'' ایک خوفناک تصویر پیش کرتا ہے جس میں پھول متی ایک ہندو سیٹھ کی بیوی ہے، چار جوان بیٹوں اور بہوؤں سے بھرے گھر پر حکمرانی کرتی ہے۔ مگر شوہر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے تمام اختیارات چھین لیئے جاتے ہیں۔ دولت سے بھی محروم کردی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے چھوٹی بیٹی کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے کردی جاتی ہے جس کی پہلی بیوی مرچکی تھی۔ یہ اس وجہ سے کہ جہیز نہ دینا پڑے۔ نیلوفر اقبال کا افسانہ ''حساب کتاب'' بھی بوڑھی ماں کے ساتھ اولاد کے سلوک پر مبنی ہے۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی بیٹے ماں سے حساب کتاب مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔

ماں اپنی زندگی میں اگر کسی چیز کی محرومی کا شکار رہی ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد کو اپنی زندگی میں ان دکھوں سے واسطہ نہ پڑے۔ مثلاً ''موم بتی کے آنسو'' منٹو کا افسانہ ہے جس میں ماں کو زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے جسم کا سودا کرنا پڑتا ہے مگر ماں کی خواہش ہے کہ اسکی بیٹی کی زندگی میں یہ مجبوری نہ آئے۔

احمد ندیم قاسمی نے ''مامتا'' میں چینی اور جاپانیوں کی جنگ کے دوران فوجی کو پیارکرتی نظر آتی بتائی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں جنسی رویہ رکھنے والی عورت اپنے معصوم بچے کیلیے مامتا کی دیوی ثابت ہوتی ہے۔ بچے کی منگیتر کی جان بچانے کے لئے اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔ بیٹے کی محبت بھی اُسے بیٹے کی طرح عزیز ہوتی ہے۔

عصمت چغتائی کا افسانہ ''ڈائن'' میں معاشرتی الجھن کی وجہ سے ماں کا منفی

روپ بھی دکھائی دیتا ہے۔ جو بیٹی کی تکلیف کے خیال سے اس کی نجی شادی شدہ زندگی میں ضرورت سے زیادہ دخل دیتی ہے۔

بیوی :

ماں کے بعد عورت بیوی کے روپ میں اپنی ذمے داریاں نبھاتی ہے۔ ہمارے ہاں بیوی کا قدیم اور مقبول تصور ایک پتی ورتا عورت کا تصور ہے۔ اس کا سب سے پہلا فرض شوہر کی خوشنودی ہوتا ہے۔

''ہمارا معاشرہ شادی نبھانے کا سارا بوجھ عورت پر ڈالتا ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ ساتھ سارے کنبے کی خدمت کرے، ایک وقت میں طرح طرح کے رشتوں کو نبھائے، شوہر کی بدمزاجیوں، بد اعمالیوں کو برداشت کرے، اُسے دوسری عورتوں سے بچا کر رکھے، اگر وہ بیوی کو نظر انداز کر کے کوٹھے پر جا بیٹھے تو یہ عورت ہی کا فرض ہے کہ وہ منت سماجت سے خود کو بنا کر سنوارکر یا پھر یہاں تک کہ دوسری عورت سے لڑجھگڑ کر شوہر کو گھر واپس لائے'' (۱)

ہندو مذہب نے شوہر پرستی کو عورت کا مذہب بتایا اور ہرحال میں وفا کرنے والی بیوی کو ''دیوی'' کا مقام دیا۔ پریم چند کے افسانے ''وفا کی دیوی'' کی تلیا جسکی شادی بچپن میں پانچ سال کی عمر میں ہی کردی جاتی ہے۔ اس کا شوہر کام کاج کے لئے گھر سے نکلا تو پھر واپس نہیں آیا۔ لیکن تلیا ساری عمر اس کے نام پر بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ گاؤں والوں نے اُسے دیوی قرار دے دیا۔

کرشن چندر کا افسانہ ''تائی اسیری'' کی تائی بھی ساری عمر شوہر کے انتظار میں گزار دیتی ہے۔ ''تائی'' پہلے دن سے ہی اس کے شوہر کو ناپسند آئی تھی۔ اسی دن سے وہ کوٹھے پر جانے لگا تھا۔ ''تائی'' کی وفاداری کی انتہا یہ ہے کہ وہ کبھی کبھار طوائف کی بھی خیریت معلوم کر آتی ہے کیونکہ وہ اس کے

(۱) اردو افسانے میں عورت کا تصور۔ عصمت جمیل ص۔ ۱۸۲

شوہر سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اپنی خدمت کو وہ اپنا دیوتا سمجھ کر پوجتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے بھی اپنے افسانوں میں ہندو عورت کے تصور کو ابھارا ہے۔ انہوں نے عورت کو ''گرہستن'' بیوی کے روپ میں دیکھا ہے۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی پتی ورتا عورت سارے سسرال کو سنبھالتی ہے۔ بچوں کی پرورش، شوہر کی خدمت، سسر کی دیکھ بھال، دیور اور نندوں کی شادیاں کرنا جیسی تمام ذمے داریاں نبھاتی نظر آتی ہے۔ ''گرم کوٹ'' میں بھی بیوی اپنے شوہر کی معمولی آمدنی میں سے پیسے بچا کر گرم کوٹ خریدتی ہے۔ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر بچوں کا پیٹ کاٹ کر ''گرم کوٹ'' خریدنا بیوی کے انتہائی خلوص اور محبت کا جذبہ پیش کرتا ہے۔

عصمت چغتائی کا افسانہ ''امربیل'' کی رخسانہ کی شادی چالیس سال کے شجاعت سے ہو جاتی ہے۔ وہ شجاعت کو دل و جان سے قبول کر لیتی ہے۔ اور ہر صورت میں حالات سے سمجھوتا کرتی ہے۔ دل وجان سے شوہر کی خدمت کرتی ہے۔ ''بیکار'' افسانے میں بھی عصمت نے عورت کی وفاداری اور خیر خواہی کو بیان کیا ہے۔ شوہر کا ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد بیوی ملازمت کر کے لوگوں کے نخرے برداشت کرتی ہے۔ شوہر کے احساس کمتری اور چرچڑے پن کو نباہ کر شوہر کے گھر کو آباد رکھنا چاہتی ہے۔ اسی میں وہ اپنی عزت سمجھتی ہے۔

بیٹی :

ماں اور بیوی کے بعد بیٹی کا ذکر کیا جائے تو بیٹی محبت ومعصومیت کی علامت ہے۔ لیکن قدیم زمانے سے ہی بیٹی سے نفرت کی روایت چلی آرہی ہے۔ اس کے نفرت کے دو پہلو تھے۔ ایک مالی اور دوسرا غیرت کا تصور کہ جوان

ہونے پر کسی دوسرے مرد کے حوالے کرنی پڑے گی۔ لیکن اسلام نے عورت کو بہت بلند مقام دیا۔ اسکے لئے حقوق و قوانین بنائے۔ اسے جائیداد میں سے حصہ دیا گیا۔ مہر کا حق دیا طلاق کا حق دیا۔ عورت سے اچھا سلوک کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے اسکی پرورش کو کارِ ثواب قرار دیا : رسول پاکؐ کے عمل نے بھی انسانی تاریخ میں عورت کے مقام کو بہت متاثر کیا۔

قرآن پاک میں فرمایاہے :

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق ط

''تم رزق کے ڈر سے (بیٹیوں) اپنی اولاد کو قتل نہ کرو''

(سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۳۱ پارہ نمبر پندرہ)

افسانوی ادب نے بھی بیٹی کے حق سماجی و معاشرتی مختلف تصورات کو ابھارا ہے۔ اس کی غلامی، بےبسی اور معاشرتی تصور کو اجاگر کیا ہے۔

'' ''راشد الخیری '' نے بیٹی کی پیدائش پر غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ اور اسکی پیدائش کو ایک سانحہ سمجھاہے۔ پردے کے نام پر اس پر کھلی ہوا تک حرام کردی گئی۔ اونچی دیوار ہو یا محل ہویا تنگ و تاریک گلیوں والے مکان، عورت پر پابندی لگادی گئی۔ ایسے میں بیٹی ایک مجبوری اور بے بسی کا نام بن گیا ہے''۔ (۱)

قدیم عرب بھی بیٹی کو زندہ دفن کر دیتے تھے کیونکہ بیٹی کی شادی کیلئے کسی کے آگے جھکنا نہ پڑے۔ آج بھی تمام قانون سازی اور تمام رواداری کے باوجود بیٹی سے جان چھڑانے کا عمل موجود ہے۔ کشور ناہید عورت کی بےبسی پر

(۱) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے افسانہ ''موؤدہ'' راشدالخیری عصمت بک ڈپو۔

تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ معاشرتی رویوں سے مجبور ہوکر خود ماں بیٹی کو پسند نہیں کرتی۔

''جدید زمانے کے الٹراساؤنڈ کے ذریعے لڑکی کے پیٹ میں ہونے کی خبر پر پانچ ماہ کا حمل ضائع کرانے کو تیار ہو جاتی ہے یا پیدائش کے بعد لڑکی کو زہریلے کیکٹس کا دودھ پلاکر مار ڈالتی ہے''۔ (۱)

''محروم وراثت'' میں راشد الخیری نے بیٹی کو بیٹوں سے کمتر سمجھا ہے۔ جتنا عرصہ بیٹی میکے میں رہے بھائیوں سے کمتر رہے پھر یہ ستم کہ وراثت سے محروم بھی رہے۔ اس کی ولادت ایک ناگہانی مصیبت مانا جاتا ہے۔

عزیز احمد کا افسانہ ''رقص ناتمام'' میں بیٹی کی پیدائش سے لے کر شادی تک کےواقعات میں لڑکی کی مرضی کا خیال نہ رکھنے کا دکھ اور بےبسی کا احساس ملتا ہے۔ بعض اوقات گھر کی بھوک مٹانے کی خاطر بیٹی کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔

محبت انسانی فطرت ہے۔ اس کے الگ الگ روپ ہے۔ ماں باپ بھی اپنی بیٹی سے محبت کرتے ہیں لیکن معاشرتی دباؤں کے ہاتھوں مجبور رہتے ہیں۔ اس کے تحفظ کی خاطر اسکی ایسی تربیت کرتے ہیں کہ دوسروں کے لئے قابل قبول بن جائے۔

''منٹو'' کا افسانہ : ''کھول دو'' باپ کی محبت کی کہانی ہے۔

عصمت کا افسانہ : ''چوتھی کا جوڑا'' میں ماں مجبور ہے کہ وہ اپنے منہ کا آخری لقمہ بیٹی کا رشتہ ہوجانے کی آس پر دوسروں کو کھلادے لیکن پھر بھی بیٹی کا کفن سینے پر مجبور ہو۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ ''لالی کی بیٹی'' کا باپ

(۱) (عصمت جمیل مقالہ برائے پی.ایچ.ڈی۔ اردو افسانے میں عورت کا تصور۔ ص۔ ۱۸۹)

مجبور ہے کہ وہ اپنی ڈاکٹر بیٹی جسے اس نے نازوں سے پالا ہے وہ اسکے شوہر کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دے۔

بہن :

انسانی رشتوں میں بہن کے رشتے سے بھی بڑی توقع ہوتی ہے۔ اسی رشتے سے بےلوث محبت کا تصور وابستہ ہے، جس نے رشتے میں حسن پیدا کردیا ہے۔ بہن کے روپ میں عورت باپ بھائی کی خیریت کی دعائیں مانگتی ہیں امام ضامن باندھتی اور بھائیوں کے صدقے قربان ہو جاتی ہے۔ عورت کی مجبوری کی آہٹ ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔

علی عباس حسینی نے افسانے ''ایک عورت ہزار جلوے '' رشید امجد نے ''ڈوبتے جسم کا ہاتھ'' افسانے میں ہیرو کے کندھے پر ماں بہنوں کا بوجھ ڈالا ہے۔ ہیرو کو بہنوں کی شادی کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے بہن کا رشتہ بھی معاشرتی رویوں کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے۔ افسانے میں کھینچی تصویریں اس کی گواہ ہیں۔ عورتوں کے ہر طرح کے مسائل '' اردو افسانوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً جنسی و معاشی مسائل پر احمد علی کا افسانہ ''مہاوٹوں کی ایک رات'' عصمت چغتائی کا افسانہ ''کلو کی ماں '' قابل ذکر ہیں۔

پریم چند نے بیوہ کے مسائل پر ''مجبوری'' نامی کہانی لکھکر بیوہ کی دوسری شادی کی حمایت کی ہے۔ ''شکنتلا'' افسانے میں احمد علی نے عورت جب میکے واپس لوٹتی ہے تو گھر والوں کو ایک نوکرانی مل جاتی ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ بیوہ کی شادی کا راستہ ہموار ہوتا گیا اور آج بیوہ کی دوسری شادی ہو جاتی ہے۔

اُردو افسانے نے طلاق شدہ عورت کے جذبات واحساسات کی بھی گواہی دی ہے۔ حسن عسکری کا افسانہ ''حرام جادی'' اس عورت کی نفسیاتی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ جس کا شوہر اسے چھوڑ چکا ہے۔ جو اسے بُری طرح مارتا پیٹتا تھا لیکن اس سے محبت بھی کرتا تھا یہی خیال باربار اسے اپنے شوہر کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ نوکری سے تھک کر بےبسی سے لوگوں کی چبھتی ہوئی نظر اسے اس خیال پر آمادہ کرتی ہے۔ شوہر کی ناپسندیدہ عورت بیاہی عورتوں میں سے ہے نہ ہی کنواری مثلاً کرشن چندر کا عظیم کردار ''تائی اسیری'' جسے اسکے شوہر نے پہلے ہی دن رد کردیا۔ پریم چند کی ''تلیا'' بھی شوہر سے محروم عورت ہے۔ جس کے ذمے اب گاؤں بھر کی عزت کا مسئلہ ڈالا گیا ہے۔ خدیجہ مستور کا کردار ''دادا'' ایک مظلوم عورت کی داستان ہے۔ جس کا بچپن محرومیوں میں گزرا۔ شادی ہوئی تو سسرال بھی ایسا ملا جہاں پیٹ بھر کھانا نہ ملتا تھا ایک روٹی کے ٹکڑے کا انتظار کرنا پڑتا۔ گھر میں ایک کو روٹی ملتی تو دوسرا محروم رہ جاتا۔ ساس بیٹے کی آمدنی پر اپنا حق جتاتی تھی کیونکہ بیوگی کی حالت میں اُسے بڑی محنت و مشقت سے اس کو پالا تھا۔ اپنے آپ کو کمزور پاکر بہو سے پوتے کو چھین کر اُسے طلاق دلوا دیتی ہے۔ طلاق شدہ عورت کو شوہر اور بیٹے کی محرومی پاگل کردیتی ہے۔ جھگڑا لو نیچر ہوجاتا ہے لڑائی جھگڑے کے کیس میں جیل جاتی ہے۔ دوسری عورتوں کے بچوں کو چھین لیتی ہے اور ''دادا'' کہلاتی ہے۔ آخر جیل میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ طلاق اسکا زندہ رہنے کا حق چھین لیتی ہے۔

---

(۱) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے افسانہ ''دادا'' خدیجہ مستور، مجبوری، پریم چند،

عصمت جمیل نے اپنے مقالے میں عورت کے تصورکو یوں پیش کیا ہے :

''بیسویں صدی کے آغاز کے افسانوں میں عورت کو دیوی قرار دیا گیا۔ عورت نے اس تصور کا بھرم رکھنے کے لئے برداشت کی حد کر دی۔ ''وفا کی دیوی'' اور تائی اسیری'' اسی دور کی یاد گار ہیں۔ بعد میں حقیقت پسندی کا رواج ہوا تو ''انگڑائی'' ''لحاف'' ''چائے کی پیالی'' جیسے افسانے سامنے آئے اور آگے بڑھے تو ''نئی بیوی'' ''فرشتہ'' اور باجی ولایت'' تک بغاوت پر آمادہ عورت اب جنسی آزادی کی طرف مائل ہے۔ مگر یہ صرف ایک رجحان ہے۔ معاشرتی پابندیوں کی گرفت اب بھی معقول حدتک موجود ہے'' (۱)

طوائف :

طوائف کی بےشمار قسمیں ہیں : داشتہ ، فاحشہ ، باندی ، نچلے درجے میں کام کرنے والی عورتیں وغیرہ کچھ خاندان پیشے کے طور پر طوائف کا پیشہ اپنائے ہوئے ہیں۔ تو کچھ عورتیں غربت یا کسی حادثے کے سبب اس پیشے کو اپنا لیتی ہیں۔

طوائف عورت کا ایک ایسا روپ ہے جس پر اردو ادب نے بہت کچھ لکھا۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں نے بھی طوائف کو افسانوں میں جگہ دی۔ ''امراؤ جان ادا'' اس وقت کی ایک بہترین مثال ہے اسوقت طوائف ایک ارادے کے طورپر کے طور پر کام کرتی تھی۔ رقص اور گانا اس کے دو بڑے فن تھے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز نے طوائف کے مظلوم طبقے کے اندرونی حالات پر روشنی

---

(۱) عصمت جمیل۔ اُردو افسانے میں عورت کا تصور۔ ص۔ ۱۹۶) پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ

ڈالی۔ اس کے مسائل کو منظر عام پر لایا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا جان دار افسانہ رشید جہاں کا ''سودا'' ہے۔ جس میں عورت کی زندگی کو مرد نے کتیا سے بھی بدتر کر دیا ہے۔ خدیجہ مستور کا افسانہ ''اوہنہ'' بھی کوٹھے والی عورت کے اردگرد گھومتا ہے۔ ''سوگندھی'' سے منٹو نے ہماری ملاقات کر وائی ہے۔ جو گندگی میں زندگی بسر کرنے والی حقیر عورت ہے۔

منٹو کے یہاں طوائفوں کے الگ الگ روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے اندر تڑپتی ماتا کو تلاش کر کے عورت کی لاچاری کو پیش کیا ہے۔ عورت جو فطرتاً ماں ہے، جسم بیچنے کا دھندا کرتے ہوئے بھی اپنے اس جذبے کو بھول نہیں پاتی۔ ''جانکی'' ''ممی'' ''موذیل'' اسی جذبے کی مثالیں ہیں۔

قرۃالعین حیدر کا افسانہ ''سنگھاردان'' کی طوائف جدید ہے۔ یہ طوائف عزت کی تلاش میں اپنا وطن چھوڑ کر انگلستان چلی جاتی ہے۔ ہوٹلوں میں کام کرتی ہے محنت مزدوری کرتی ہے ہندوستان کے لوگ اُسے پہچان کر اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہندوستان میں کرتے تھے۔

اختر حسین رائے پوری کا افسانہ ''مجھے جانے دو'' عصمت کا افسانہ ''جڑیں '' نیلم احمد بشیر کا ''شریف'' منٹو کا افسانہ ''کلونت کور'' غلام عباس حسینی کا افسانہ ''پردہ فروش'' وغیرہ افسانہ نگاروں نے ان تمام عورتوں کی مجبوری، بےبسی سادگی یا پھر چالاکی، لالچ جیسے رویوں کی گواہی دی ہے۔

محبوبہ :

محبوبہ اُردو ادب کی دلربا مخلوق ہے اُسے ہی صنف نازک کہا جاتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ''خارستان و گلستان'' اورسو دائے سنگین ''لکھ کر افلاطونی محبت بکھیر دیں۔

کرشن چندر رومانوی افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کشمیری دوشیزاؤں کے الھڑپن، سادگی اور حسن کو اپنے افسانے میں سمویا ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنے افسانے ''کلو'' میں عورت کی طرف سے اظہار عشق کو اپنا موضوع بنایا۔ عورت جب تک محبوبہ ہوتی ہے مرد اس کی ہر ادا کو برداشت کرتا ہے۔ اُردو ادب و شاعری میں ہمیشہ عورت ایک اہم کردار کے طور پر شامل رہی ہے۔ معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ساتھ افسانے میں اس کردار کا تصور بھی بدلتا گیا۔

افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ عالمی سماج کی عورتوں کی صورت حال کا اندازہ لگاتے ہیں تو افسانوی ادب کی طرح عالمی سماج میں اور اسلامی سماج کی تاریخ میں بھی عورت کا ایک مقام معین ہیں۔ کیونکہ عورت دنیا کا سب سے قدیم اور اہم موضوع ہے۔ چنانچہ یہ موضوع جتنا قدیم ہے اتنا ہی وسیع ہے۔ ہر عہد میں مصلحین۔ مفکرین، مبلغین اور ناقدین نے عورت پر لکھا۔ لیکن عورت ایک نہ سمجھ آنے والی حقیقت ہے۔ ایسی حقیقت جسے ہمیشہ تصور کی آنکھ سے دیکھا جاتا رہا۔ حالانکہ عورت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ اور انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ تاریخ میں ایک عہد ایسا بھی رہا ہے جس میں عورتوں کو افضلیت حاصل تھی۔ یہ ویدک عہد تھا۔ جہاں آریہ عورتوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک سے پیش آئے تھے۔ انھیں مردوں کی طرح تمام سہولیات حاصل تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ عورتوں کی آزادی سمٹتی چلی گئی، ان کے حقوق اور اختیارات محدود ہونے لگے، کبھی عورت ہر دور میں مظلوم اور حق

وانصاف کی طلبگار بھی رہی ہے۔ سماجی نظام نے اسے قید کر دیا جس سے اس کی تمام شخصیت سمٹ کر رہ گئی۔

عورت اور سماج میں محمد شہزاد شمس نے لکھاہے۔ بقول اگست بیل :

''کبھی وہ لو نڈیوں کے درجے میں رکھی گئی تو کبھی بازاروں اور میلوں میں خریدی اور بیچی گئی، کبھی اُسے مجسم گناہ اور بدی کا سر چشمہ سمجھا گیا تو کبھی زہریلی ناگن سے بھی بدتر سمجھا گیا، کبھی اُسے ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم کیا گیا تو کبھی اس کے ساتھ موت سے بھی زیادہ تلخ کہہ کر حیوانوں سے بدتر سلوک کیا گیا۔ کبھی اس کے وجود ہی کو باعث ننگ سمجھ کر زندہ درگور کیا گیا تو کبھی شوہر کی چتاپر زندہ جلنے پر مجبور کر دیا گیا''۔ (۱)

''آگے چل'' کر تاریخ میں ایسا دور بھی آیا جب اسے عملی زندگی میں برابر کا شریک بھی مانا گیا۔ اور اسے پوری عزت و اہمیت دی گئی بعض اوقات اس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور بھی رہی اور کہیں کہیں اسے قبیلے اور خاندان میں کافی عزت اور وقار کی نظر سے بھی دیکھا گیا۔ افریقہ میں پچھڑے علاقے کے چند قبیلے عورتوں کے ذریعہ چلائے جاتے تھے۔ افضان-۵ کے ایک قبیلہ میں عورتیں شکار کرتیں اور جنگیں لڑتی تھیں۔ جبکہ مرد گھروں کی نگہبانی کرتے تھے۔ مغربی افریقہ میں اشنتی (Ashantee) کے راجا اور مرکزی افریقہ میں ڈھاے (Dahomey) کے راجا کی محافظ عورتیں ہوتی تھیں۔ اور فوجوں کے اعلیٰ افسر بھی عورتیں ہوتی تھیں۔ مرد فوجی دستہ کے مد مقابل عورتوں کے فوجی دستہ کو اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود بحیثیت مجموعی عورت مظلوم

---

(۱) محمد شہزاد شمس ''عورت اور سماج'' ص-۱۵

ہی رہی۔ اسے کسی بھی طرح کے سماجی اور سیاسی حقوق سے محروم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی'' (۱)

یونان کی تہذیب دنیا کی قدیم تہذیب ہے۔ یونانی لٹریچر میں عورت کا مرتبہ کم تر تھا۔ وہ تباہی کا باعث تھی۔ قدیم یونان میں عورت کی سماجی حالت بہت بہتر نہیں تھی۔ یونانی ذہن عورت کو ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق سمجھتا تھا۔ سید امیر علی لکھتے ہیں:

''یونانی معاشرے کی عورت کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ وہ ووٹ نہیں دے سکتی تھی۔ مشہور یونانی مورخ پلوٹارک (Plutarch) کا خیال تھا کہ عورت کا نام اور اس کا جسم گھر میں قید رہنا چاہئے عورت گھر کے زنانہ حصہ میں وقت گزارتی تھی اسے کسی مرد سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ تعلیم حاصل کر سکتی تھی۔ پڑھی لکھی خواتین جو اس قید کی زندگی سے بغاوت کرتی تھیں وہ طوائفیں بن جاتی تھیں۔ یوں یونان میں عورتوں کے دو واضح طبقے بن گئے تھے۔ شادی شدہ غلام عورت ، آزاد اور پڑھی لکھی طوائف۔ نکاح کو ایک غیر ضروری رسم سمجھا جاتا تھا۔ مرد طوائفوں کے ساتھ مجلسی زندگی گزارتے اور بیویوں کو قید رکھتے۔ اس نظام کی وجہ سے اخلاقی حالت دگرگوں تھی۔ افلاطون اور ارسطو جیسے عالموں کے ہاں بھی عورت کا درجہ کمتر ہی تھا۔ ایتھنز کے شہریوں کو لاتعداد شادیوں کی اجازت تو تھی ہی طلاق کا اختیار بھی اتنا ہی لامحدود تھا۔ بد چلنی کے شبہ میں بیوی کو قتل کیا جا سکتا تھا اور اسکی کوئی سزا مقرر نہ تھی'' (۲)

---

(۱) محمد شہزاد شمس 'عورت اور سماج'' ص-۱۵

(۲) محمد جاوید ''اردو غزل میں عورت کا تصور۔ ص۱۱ بحوالہ سید امیر علی روح اسلام صفحہ ۳۵۶

اس کے علاوہ قدیم یونانیوں میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ :

''شادی کے بعد لڑکی جس گاڑی سے شوہر کے گھر جاتی تھی وہ گاڑی شوہر کے گھر جاتی تھی وہ گاڑی شوہر کے دروازے پر ہی جلا دی جاتی تھی۔'' (۱)

یہ رسم اس بات کی علامت تھی کہ اب اس لڑکی کے پچھلے تمام رشتے ختم ہو گئے اور اب وہ مکمل طور پر شوہر کی ملکیت ہو گئی۔ شوہر اب اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے طوائف کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنی سے لے کر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز بنا ہوا تھا۔

یونان کے زوال کے بعد رومن سلطنت کو عروج حاصل ہوا۔ اور یہ عروج صدیوں قائم رہا۔ اور اسلام کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ یونانیوں کی طرح روم میں بھی عورت اپنی تمام زندگی کسی نہ کسی مرد کے تابع رہتی تھی۔ اس پر پابندیاں تھیں لیکن یونانی عورت کی طرح وہ گھر میں قید نہیں تھی۔ یونانی فتح کرنے کے بعد روم میں خوشحالی بڑھ گئی۔ دولت کی فراوانی نے عورتوں کے اطوار کو بگاڑ دیئے۔ اونچے گھرانوں میں شادیاں دولت اور سیاست کے تابع ہو گئیں۔ عورتوں کو شادی میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

انہوں نے فلسفہ اور ادب پڑھنا شروع کردیا مقرر بن گئیں۔ گانا اور ناچنا اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ایک بے لگام آزادی کی لہر میں انہوں نے بہنا شروع کردیا۔ پی براؤن (P.Brow) لکھتے ہیں :

''مشہور رومن شاعر جوونال (Juvenal) کی رائے میں روم جیسے بڑے شہر میں کوئی ایک عورت بھی اس قابل نہیں تھی کہ اس سے شادی کی جا سکے''۔ (۲)

---

(۱) ڈاکٹر محمد شہزاد شمس۔ عورت اور سماج۔ ص - ۱۸

(۲) محمد جاوید ''اردو غزل میں عورت کا تصور'' ص-۱۲

رومی تہذیب میں عورت کی سماجی حالت بدتر تھی، اسے کسی طرح کا انسانی اور قانونی حق حاصل نہیں تھا۔ اگر انہیں اپنی بیویوں سے کوئی شکایت ہوتی تو طلاق کی بجائے وہ انہیں قتل کردیا کرتے تمام خاندان پر مرد کا تسلط تھا۔ اس لئے تمام کاموں میں مرد کا حکم چلتا تھا۔ عورتوں کو کسی معاملے میں کوئی اختیار نہیں تھا۔ مثلاً......

''رومن قانون کے مطابق مرد عورت کے جسم و جان کا مالک ہو جاتا تھا۔ عورت کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی تھی طلاق کا اختیار صرف مرد کو تھا''۔ (۱)

رومن عورتوں کی پستی کا یہ عالم تھا کہ اگر اس کا شوہر انتقال کرجاتا تو وہ اپنے بیٹوں کی وراثت میں منتقل ہو جاتی تھی اور اگر بیٹے نہیں ہوتے تو اپنے دیور یا شوہر کے چچا کے قبضے میں اسے جانا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں ''تاریخ اخلاق یوروپ'' میں لکھا ہے :

''عورت کا مرتبہ رومی قانون نے عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔ افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر، اسے اپنی بیوی، بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا۔ اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔ باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جب چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے، بلکہ بعض دفعہ تو وہ اس کی شادی کو توڑ بھی سکتا تھا۔ زمانہ ما بعد یعنی دور تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہوگیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہوگئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل کر سکتا ہے۔ ۵۲۰ سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہیں سنا''۔ (۲)

---

(۱) ڈاکٹر محمد شہزاد شمس ''عورت اور سماج'' ص-۲۰

(۲) ایضاً ایضاً۔

رومی معاشرہ :

لونڈی اور غلام اگر آپس میں شادی کرلیتے تو اس کو قانون بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ امیر علی لکھتے ہیں :

''رومی معاشرہ میں غلام اور لونڈی کی باہمی شادی قانوناً تسلیم نہیں کی جاتی تھی جب کہ غلام مرد کی شادی آزاد عورت سے اور آزاد مرد کی شادی غلام عورت سے قطعاً ممنوع تھی۔ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کرلیتی تو اس کے لئے سزاؤں میں سے ایک سزا یہ تھی کہ وہ قتل کردی جائے اور غلام کو زندہ جلا دیا جائے''۔ (۱)

مصری تہذیب میں بھی عورت کا سماجی مرتبہ بلند تھا۔ قدیم مصر کی جتنی بھی تحریریں ملتی ہیں۔ ان سب میں کسی نہ کسی صورت میں ماں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ اس کے خوراک اور لباس کے بارے میں بھی تلقین کی گئی ہے اور بیٹوں سے کہا ہے کہ تو اس کا سہارا بن جس طرح وہ تیرا سہارا بنی تھیں۔

قدیم مصر میں عورتیں سبھی کاموں میں مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ یونان میں تمام ترقیوں کے باوجود عورتوں کو تعلیم کے زیور سے محروم رکھا جاتا تھا۔ مگر ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق قدیم مصر میں عورتیں تمام علوم حاصل کرتی تھیں، اور زراعتی کاموں میں مردوں کے برابر حصہ لیتی تھیں۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ زراعت کی ابتداء عورت نے ہی کی ہے۔ چنانچہ '' سفرنامۂ جنوبی افریقہ'' میں ہیروڈوٹس نے لکھا ہے۔ محمد شہزاد نے اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے :

---

(۱) محمد جاوید '' اردو غزل میں عورت کا تصور '' ص-۱۲

''عورت نے صرف یہی نہیں کہ صحرائی پیداوار سے غذا کا کام لیا ہو بلکہ اس نے زمین کھود کر تخم ریزی بھی کی اور اس طرح اوّلین زراعت کی بنیاد ڈالی''۔ (۱)

مصر کی ہزاروں سالہ قدیم تہذیب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عورتیں دو قسم کی ہوتی تھیں باعزت اور فاحشہ۔ عزت دار عورت اپنے خاندان کی حفاظت کرتی تھیں اور فاحشہ عورت خاندان کو برباد کرتی تھیں۔ عام مصری معاشرے میں شادی کے سلسلے میں بھی کوئی مذہبی یا سیکولر رسومات نہیں تھے۔ طلاق کا بھی رواج تھا۔ طلاق پسند ناپسند۔ مرد کا دوسری شادی کرنا یا بانجھ ہونا کچھ بھی ہوتا تھا۔ مطلقہ عورت دو بارہ شادی کر سکتی تھی۔ طلاق کی صورت میں عورت اپنا جہیز واپس لے جا سکتی تھی۔ مصر میں عورت کو ایک مخصوص درجہ حاصل تھا۔ تمام جائیداد عورتوں سے عورتوں کو یعنی ماں سے بیٹی کو ورثے میں ملتی تھی۔ اس اقتصادی برتری کی وجہ سے معاشرے میں عورتوں کو مردوں کی نسبت اونچا مرتبہ حاصل تھا۔ ابن حنیف لکھتے ہیں کہ :

''قدیم مصری عورت کی عظمت اور تقدس سے غافل یا ناآشنا نہیں تھے۔ ان کے پرانے لٹریچر کو پڑھا جائے اس میں عورت اپنے ہر رنگ ، ہر روپ میں ملے گی۔ وفادار اور جاں نثار بیوی، اچھی ماں، پُرخلوص اور پُرجوش محبت کرنے والی دوشیزہ، طوائف، برائیوں کو ترغیب دینے اور پیش دستی کرنے والی بدکردار عورت''۔ (۲)

زرتشتیوں کے ہاں یعنی ایران میں بھی عورت کا تصور دوسرے ملکوں کی طرح مردوں کے ہاتھ میں تھا۔

---

(۱) ڈاکٹر محمد شہزاد شمس ''عورت اور سماج'' ص-۱۹

(۲) ابن حنیف مصر کا قدیم ادب جلد چہارم ص-۶۳۸

''دوسرے بہت سے ملکوں کی طرح ایران میں بھی عورت کی موت و زندگی کا اختیار مرد کے ہاتھ میں تھا۔ امیر مرد عورتوں کو پردہ کی ترغیب دیتے اگر چہ ان کی نظر میں عورتوں کی سماجی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی، کیونکہ یہاں عورت کی دنیا گھر کی چہار دیواری کے اندر محدود تھی۔ قدیم عمارتوں، کتبوں اور مندروں سے جو تصویریں یا جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان میں نہ تو کسی عورت کی تصویر یا مجسمہ ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی کتب ہی ہے''۔ (۱)

ایرانی جب چاہتے عورتوں سے قطع تعلق کر لیتے اور انہیں طلاق دے سکتے تھے۔ ازدواج کے متعلق کوئی مسلم قانون موجود نہ تھا۔ بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ کی گئی تھی۔ اس طرح معاشرے میں عورتوں کی کوئی عزت نہیں تھی۔

چین میں بھی زمانۂ قدیم میں کوئی حیثیت و عزت نہیں تھی۔ ایک مرد کئی عورتوں سے شادی کر سکتا تھا۔ بعض حالات میں مردوں کو ایک سو تیں عورتیں رکھنے کا اختیار تھا۔ عام حالات میں زائد شادیاں کرنے کو منع کیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں لونڈیاں رکھنا جائز تھا۔ جس کی سماجی حیثیت بیوی سے کمتر تھی۔ مگر اس کی اولاد کو اصل بیوی کی اولاد کے برابر حقوق حاصل تھے۔ چین کی ایک مہذب خاتون عورت کے بارے میں لکھتی ہیں :

''ہم عورتوں کا مقام انسانیت کا سب سے گرا ہوا مقام ہے۔ اس لئے ہمارے حصہ میں سب سے حقیر کام آئے ہیں۔ عورت کس قدر بد نصیب ہے۔ پوری دنیا میں کوئی چیز اس سے زیادہ بے قیمت نہیں''۔ (۲)

قدیم عرب میں بھی اسلام کے قبل عورت کی سماجی حالت بہت خستہ تھی۔ لڑکیوں کی پیدائش کو ذلت کا سبب سمجھا جاتا۔ اسے زندہ دفن کردیا جاتا

---

(۱) ڈاکٹر محمد شہزاد شمس ''عورت اور سماج'' ص-۲۱

(۲) ایضاً۔ ص-۲۰

تھا۔ عربوں میں عورتوں کے متعلق چند تعصّبات بھی رائج ہو گئے تھے عربوں کا کہنا تھا کہ ....

''عورت فطری طور پر ضعیف الحبثہ اور ضعیف الدماغ ہوتی ہے۔ مرد کی اعانت کے بغیر وہ نہ تو ضروریات زندگی مہیا کر سکتی ہے اور نہ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت''۔ (۱)

عرب میں ایک طرف عورت کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تو دوسری طرف اسکی عزت و قدر کی جاتی۔ اس کا ذکر اس طرح کیا ہے :

''عرب کے مختلف قبائل نے عورت کی سماجی زندگی اور اس کے حقوق کو نہ صرف پامال کیا بلکہ وحشیانہ سلوک کا رویہ اپنایا۔ اس سماج میں عورت ایک جائیداد کی حیثیت رکھتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اسے فروخت کردیا جاتا تھا بیوی کو زمین اور جوئے میں داؤ پر لگا دینے کا رواج تھا۔ سوتیلی ماں سے شادی رچانے اور اپنی بیوی کو خاص مدت تک دوسروں کو کرایہ پر دینے کی رسم بھی تھی۔ اس طرح عورت کی مظلومی اور بے بسی کا جو نقشہ عربوں کے یہاں ابھرتا ہے اس سے عورتوں کی ذلت بھری داستان کی نشاندہی ہوتی ہے''۔ (۲)

''دوسرا پہلو عرب خاندان کے اندر عورت کی عزت کی جاتی تھی۔ یہاں تک کے قبیلوں کے جنگوں میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا اور خیموں کے اندر کی زندگی میں سب سے بڑی حاکم بھی وہی ہوا کرتی تھیں۔ بدّو عورتیں بھی، جو خانہ بدوشی کی زندگی گزارتی تھیں، اپنے خاندانی معاملات میں اہمیت رکھتی تھیں اور مختلف کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں''۔ (۳)

---

(۱) ڈاکٹر محمد شہزاد شمس ''عورت اور سماج'' ص-۲۲

(۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

عربوں میں عورت سے نفرت اور بیزاری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک شخص کے گھرلڑکی پیدا ہوئی تو اس گھر کو ہی منحوس سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ عرب سماج کے کچھ اندوہناک واقعات منقول ہیں کہ انہیں سنکرہی دل کانپ جاتا تھا۔

''ایک شخص نے نبیؐ سے اپنے جاہلیت کے زمانہ کا واقعہ سنایا کہ ''میرے ایک بچی تھی اور وہ مجھ سے بہت مانوس بھی تھی۔ جب کبھی میں اسے بلاتا تو بڑی ہی مسرت سے میرے پاس آجاتی چنانچہ ایک دن میں نے اُسے آواز دی تو وہ میرے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آئی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا اور قریب کے ایک کنویں میں جھونک دیا اور اس وقت بھی ابّا جان ابّا جان ہی کہتی رہی۔ واقعہ کو سنکر نبی ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ریش مبارک تر ہو گئی''۔ (۱)

عورت حسن کی دیوی بنی دیوتاؤں کا مرکز بنی۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی، کنیز اور طوائف بنی۔ ہر طرح ہر روپ میں انسانی سماج میں، عالمی سماج میں، اسلامی معاشرے وسماج میں، انسانی سماج کی تعمیر کرتی رہی۔

اسلامی معاشرے میں عورت کو ایک معتبر حیثیت حاصل تھی۔ اس کی مثال حضرت خدیجہؓ ہیں۔ وہ جب تک زندہ رہیں رسول اکرمؐ کا سب سے مضبوط سہارا بنی رہیں اور مسلمان عورتوں کے لئے ایک مثال بن گئیں۔ رسولِ پاکؐ کا حضرت خدیجہؓ سے سلوک بیوی کا مثالی سلوک قرار پایا ہے۔

(۱) سیدجلال الدین ''عورت اسلامی معاشرہ میں'' ص-۲۰

اسلام نے بیٹی کو باعث رحمت قرار دیا۔ حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کا سلوک مثال بن گیا۔ آپؐ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جس شخص نے ایک یا ایک سے زیادہ بیٹیوں کی پرورش کی وہ جنت میں جائے گا۔

ماں کا اسلامی تصور بھی بہت بلند ہے۔ ہمارے نبی حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ ''تم پر سب سے زیادہ حق تمہاری ماں کا ہے''۔ ماں کے تقدس اور عظمت کا تصور کسی نہ کسی شکل میں ہر معاشرے میں موجود ہوتا ہے۔ ادب بھی اس کے اظہار میں شامل ہے۔

☆☆☆